© rasailojaraid.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

مذاہب کے عروج و زوال کا اگر مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اُن کے ارتقاء اور انحطاط کی کڑیاں اگرچہ مختلف واقعات و حادثات سے عبارت ہیں مگر ان میں چند کڑیاں بہر حال ایسی ہیں جو قریب قریب سارے مذاہب کی تاریخ میں مشترک نظر آتی ہیں اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ دنیا کے سارے مذاہب عروج و زوال کے جن مراحل میں سے گزرتے ہیں وہ قریب قریب ایک جیسے ہیں۔

ان مراحل کی نشاندہی کرنے سے پیشتر یہ ضروری ہے کہ سب سے پہلے یہ سمجھ لیا جائے کہ مذہب فی الحقیقت کیا چیز ہے۔ اس کا آغاز کیونکر ہوتا ہے اور اُسے زوال کیوں آتا ہے۔ مذہب دراصل نام ہے اَن دیکھی حقیقتوں پر ایمان لانے کا، جو اگرچہ انسان کے مشاہدے کی حدود سے باہر ہیں تاہم جن کی تصدیق عقلِ سلیم سے ہوتی ہے اور جو انسانی روح کو تسکین دینے کا سامان فراہم کرتی ہیں اور اُسے حیوانیت یا مادہ پرستانہ طرزِ عمل سے بلند کر کے اخلاقی اور روحانی اقدار کے مطابق زندگی بسر کرنے کی تحریک اس میں پیدا کرتی ہیں۔ یہ مذہب کی ایک ایسی تعریف ہے جس میں اس کے سارے اجزا آجاتے ہیں۔ اس کے مطابق مذہب روح کی بالیدگی، فکر و نظر اور جذبہ و احساس کی پاکیزگی اور ابنائے نوع بلکہ ساری مخلوق کی خیر خواہی کا دوسرا نام ہے۔ پھر اس تعریف کے مضمرات پر غور کرنے سے یہ بات بھی منکشف ہو جاتی ہے کہ مذہب مادّی زندگی کی ضد نہیں بلکہ مادہ پرستانہ طرزِ فکر اور طرزِ عمل کی ضد ہے۔

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر انسان مذہب کی ضرورت کیوں محسوس کرتا ہے۔ اس کا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سادہ سا جواب یہ ہے کہ چونکہ انسان ایک ذی روح مخلوق ہے اس لیے وہ مادی علائق میں گرفتار ہونے کے باوجود اپنی رُوح کی تسکین کے لیے بے تاب رہتا ہے اس لیے وہ کسی نہ کسی مذہب کو اپنانے پر مجبور ہوتا ہے۔ روحانیت اور مذہب کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ انسان جب تک اپنے اندر روح رکھتا ہے وہ مذہب سے کسی طرح چھٹکارا حاصل نہیں کر سکتا۔ اس جواب میں اُس مقصد کی بھی نشاندہی موجود ہے جس کے لیے مذہب دنیا میں موجود ہے۔ اگر مذہب نہ ہو تو انسان کے خوب و ناخوب کے پیمانے صرف مادی سُود و زیاں کو سامنے رکھ کر بنائے جائیں مگر انسان ہزاروں دعووں کے باوجود اس بات پر آج تک آمادہ نہیں ہو سکا کہ اُس کی پُوری زندگی مادّی اقدار سے عبارت ہو اور وہ زندگی کے ہر معاملے کو صرف مادی نفع و نقصان سے حل کرے۔ وہ قومیں جنہیں آج اپنی مذہب بیزاری پر بڑا ناز ہے اور جنہیں اس نعش کو ٹھکانے لگانے کا بڑا دعویٰ ہے وہ بھی اس سے پوری طرح گلو خلاصی حاصل نہیں کر سکیں۔ اُن کے ہاں بھی مرد کا اپنی ماؤں بہنوں سے شادی کرنا سخت ناقابل تصور اور ناقابلِ برداشت ہے۔ اور انسانی لاشیں جن کی ہڈیوں اور خون سے بہت سے مالی فوائد حاصل ہو سکتے ہیں، اُن سے یہ فائدے حاصل نہیں کیے جاتے بلکہ انہیں زمین میں دفن کر کے معاشی نقطۂ نظر سے قومی زیاں کیا جاتا ہے۔

مذہب جیسا کہ میں نے اوپر ذکر کیا ہے انسان کی کوئی مادّی ضرورت نہیں بلکہ اس کی روحانی اور اخلاقی ضرورت ہے۔ اس لیے باری تعالیٰ نے انسان کی پیدائش کے وقت جہاں اُس کی مادّی ضروریات کی فراہمی کا التزام کیا وہاں اُس کی اس روحانی ضرورت کو پُورا کرنے کے لیے دینِ حق پہنچانے کا انتظام فرمایا۔ اس نقطۂ نظر سے اگر دیکھا جائے تو یہ نظریہ بنیادی طور پر باطل معلوم ہوتا ہے کہ مذہب چند اسباب اور حالات کا نتیجہ ہے اور اسے کسی دَور کے مخصوص تقاضے جنم دیتے ہیں۔ اسلامی فلسفہ کے مطابق مذہب حالات کی پیداوار نہیں بلکہ یہ حالات کو ایک خاص نہج پر ڈھالنے کے لیے دنیا میں نازل کیا گیا ہے۔ سورۂ بقرہ میں ہدایتِ الٰہی کا ذکر جس انداز سے کیا گیا ہے وہ اس کی پوری طرح تصدیق کرتا ہے:

فَاِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ مِّنِّىْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ — پھر اگر تمہیں میری طرف سے کوئی ہدایت پہنچے تو جو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

هُدَایَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ۔ لوگ میری اس ہدایت کی پیروی کریں گے اُن کے لیے کسی خوف اور رنج کا موقع نہ ہو گا۔

یہاں ہدایت سے متعلق دونوں امور یعنی ہدایت پہنچانے اور ہدایت کی پیروی کرنے کے ساتھ باری تعالیٰ نے واحد متکلم کا صیغہ استعمال کیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ہدایت جو انسان کو اُخروی خوف سے نجات دلا سکتی ہے وہ صرف وہ ہدایت ہے جو باری تعالیٰ کی طرف سے انسان کی رہنمائی کے لیے دی گئی ہے۔ چنانچہ یہ ہدایت کسی عصری تقاضے یا کسی ماحول کی پیداوار نہیں بلکہ جس قادر مطلق نے انسان کو پیدا کیا، اُس نے اُسے اس کرہ ارضی پر اتارتے ہی اس کے رُشد و ہدایت کا التزام فرمایا۔

اسلام کے سطح بین نقاد ہدایت کے متعلق اُس کے اس اساسی تصور کو نظر انداز کر دیتے ہیں اور باطل فلسفوں کی رُو سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ مذہب کو انسان کی مادی ضروریات نے جنم دیا ہے اور ان احتیاجات کے تبدیل ہونے کے ساتھ مذہب بھی بدلتا رہتا ہے۔ اس نقطۂ نظر کے برعکس اسلام ہمیں یہ بتاتا ہے کہ ہدایت کا سرچشمہ باری تعالیٰ ہے اور انسان کی فلاح و بہبود کا راز صرف اس چیز میں مضمر ہے کہ وہ اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو اُس کے مطابق ڈھالے۔ اس حقیقت کو دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ انسان جو کچھ تغیر و تبدل کرتا ہے وہ ماحول میں کرتا ہے۔ وہ ہدایت الٰہی میں کسی قسم کی تبدیلی کرنے کا مجاز نہیں۔ قرآن مجید نے اس قسم کے من مانے تغیرات کو شرک سے تعبیر کیا ہے چنانچہ سورۂ توبہ میں ارشاد ہے:

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِیْحَ ابْنَ مَرْیَمَ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِیَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ سُبْحٰنَهٗ عَمَّا یُشْرِكُوْنَ ۔ (۳۱ - ۹)

انہوں نے اپنے علماء اور مشائخ کو اللہ کے سوا اپنا رب بنا لیا ہے، اسی طرح مریم کے بیٹے عیسیٰ کو بھی حالانکہ ان کو جو حکم دیا گیا تھا وہ اس کے سوا اور کچھ نہ تھا کہ ایک ہی خدا کی بندگی کرو۔ اس کے سوا کوئی بندگی کے لائق نہیں۔ پاک ہے وہ ان مشرکانہ باتوں سے جو یہ لوگ کرتے ہیں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ترمذی میں روایت ہے کہ جب حضرت عدی ابن حاتم عیسائیت کو خیرباد کہہ کے حلقہ بگوش اسلام ہوئے تو آپ نے بارگاہِ رسالت میں جو مختلف سوالات پیش کیے ان میں ایک یہ بھی تھا کہ عیسائیوں کے بارے میں قرآن مجید کا جو یہ ارشاد ہے کہ انہوں نے علماء اور مشائخ کو اپنا رب بنا لیا ہے تو اس کی حقیقت کیا ہے۔ حضورؐ نے اس کی صراحت کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ جس چیز کو حلال کہہ دیتے تم اُسے حلال جان لیتے اور جس کے بارے میں حرمت کا فیصلہ کر دیتے تم اُسے حرام مان لیتے۔ بس یہی ان کو اپنا رب بنا لینا ہے۔ یعنی حلال و حرام کا حکم دینا باری تعالیٰ کا کام ہے اور ان لوگوں نے اللہ کے اس حق کو مخلوق کے ایک طبقے کو سونپ دیا تھا۔

پھر سورۂ انعام میں بڑے واضح الفاظ میں یہ بھی فرما دیا ہے کہ ہدایت کا سرچشمہ صرف باری تعالیٰ ہے اور انسان کی فلاح و کامرانی کا راز اسی بات میں مضمر ہے کہ اس ہدایت کی پیروی کرے۔

قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى وَ اُمِرْنَا لِنُسْلِمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۔ (۷۱)

آپ کہہ دیجیے کہ صحیح رہنمائی تو صرف اللہ ہی کی رہنمائی ہے اور اس کی طرف سے ہمیں یہ حکم ملا ہے کہ مالکِ کائنات کے آگے سر خم کر دو۔

سورۂ اعراف میں ہدایت الٰہی کی پیروی کے ساتھ ساتھ اس امر کی بھی تاکید کی گئی ہے کہ اس ہدایت کے علاوہ کسی دوسرے نظریے یا کسی دوسرے فلسفے یا کسی دوسرے طرزِ عمل کو اپنانا اپنے آپ کو گمراہی میں مبتلا کرنا ہے۔

اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ لَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ (۳)

اُس ہدایت کی پیروی کرو جو تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہاری طرف اتاری گئی ہے۔ اور اپنے رب کو چھوڑ کر دوسرے سرپرستوں کی پیروی نہ کرو

مِنْ دُوْنِهٖ میں ضمیر رَبِّكُمْ کی طرف لوٹتی ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ کے ساتھ کسی دوسرے کو مُطاع نہ بناؤ۔

اولیاء کا لفظ بڑا جامع ہے اور اس میں ہر قسم کے سرپرست، متولی اور مددگار شامل ہو جاتے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہیں جن کی طرف انسان رشد و ہدایت کے لیے رجوع کرتا ہے اور وہ اُسے غلط راستوں پر لے جا سکتے ہیں۔ انسان عام طور پر دو طبقوں سے متاثر ہو کر گمراہ ہوتا ہے۔

(۱) مذہبی اور دینی طبقہ۔ چونکہ انسان کو اس طبقے پر بڑا اعتماد ہوتا ہے اس لیے یہ بڑی آسانی کے ساتھ سادہ لوح عوام کے ذہنوں میں گمراہی کے جراثیم داخل کر سکتا ہے۔ یہ طبقہ عام طور پر نیکی اور تقدیس کی آڑ میں شکار کھیلتا ہے اور اپنے ذاتی خیالات و افکار کو اور اپنے دل پسند نظریات کو ہدایت الٰہی کی حیثیت سے لوگوں کے سامنے پیش کر کے انہیں ان کی پیروی کی دعوت دیتا ہے اور جو لوگ اس کی ان خرافات کو صدق دل سے قبول کر لیں انہیں جنت کی بشارتیں دیتا اور انکار کرنے والوں کو دوزخ کے عذاب سے ڈراتا ہے۔ اس طبقے کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔

(ب) دوسرا طبقہ معاشرے کے با اثر افراد پر مشتمل ہے۔ اس طبقے میں اصحاب اقتدار، اصحاب ثروت یا سوسائٹی کے دوسرے قائدین شامل ہیں جن کی قیادت اور رہنمائی میں لوگ بالعموم چلتے ہیں اور جن کی آراء معاشرے میں بڑا وزن رکھتی ہیں۔ یہ حضرات اقتدار یا دولت و ثروت کے بل بوتے پر عوام میں اپنے گمراہ کن نظریات پھیلاتے رہتے ہیں اور اگر وہ انہیں قبول کرنے میں متامل ہوں تو پھر اُن پر مختلف حیلوں بہانوں سے عرصۂ حیات تنگ کیا جاتا ہے۔ قرآن مجید نے جس جماعت کے لیے الملاُ کا لفظ استعمال کیا ہے وہ یہی طبقہ ہے۔ ائمہ لغت نے اس کے جو معنی بیان کیے ہیں اُس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ طبقہ ایسے با اثر لوگوں پر مشتمل ہے جن سے عوام یا تو ذہنی طور پر مرعوب ہوں یا اُن کی ہیبت اور جلال سے خوفزدہ ہو کر اُن کے بتاتے ہوئے راستے پر چلنے پر مجبور ہوں۔ اس طبقے میں مفکرین، شعراء، ارباب صنعت و تجارت کے نگران اور زمام اقتدار کو سنبھالنے والے حضرات شامل ہیں فلسفی، شاعر اور ادیب باطل افکار و نظریات کے طلسم سے لوگوں کی نظروں کو خیرہ کر کے انہیں حق و صداقت کے راستے سے ہٹاتے ہیں۔ بڑے بڑے تاجر اور صنعت کار روپے پیسے کے زور سے کسی معاشرے میں شر و فساد پھیلاتے ہیں اور ارباب اختیار اپنے وسیع اختیارات کے ذریعہ اپنے غلط تصورات کے مطابق سوسائٹی کو غلط راستے پر چلاتے ہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اللہ کے دین سے بغاوت اور سرکشی کی ایک بڑی وجہ نفس کی بندگی بھی ہے۔ انسان بسا اوقات خارجی دباؤ کے تحت نہیں بلکہ اپنے نفس کے تقاضوں کے تحت راہِ حق کو خیر باد کہہ کر ظلمت اور گمراہی کے راستے کو اختیار کر لیتا ہے۔ خواہشِ نفس کی پیروی کرنے والوں کی محرومی اور بربادی کا اعلان قرآن مجید نے ان الفاظ میں کیا ہے:

وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰىهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۔ (قصص ۔۔ ۵۰)

اور اُس سے زیادہ گمراہ اور بھٹکا ہوا کون ہے جو اللہ کی ہدایت سے ہٹ کر اپنی خواہشات کی پیروی کریں۔ اللہ ایسے ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا۔

اور سورۂ فرقان میں فرمایا گیا:

اَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰـهَهٗ هَوٰىهُ ۭ اَفَاَنْتَ تَكُوْنُ عَلَيْهِ وَكِيْلًا ۔ اَمْ تَحْسَبُ اَنَّ اَكْثَرَهُمْ يَسْمَعُوْنَ اَوْ يَعْقِلُوْنَ ۭ اِنْ هُمْ اِلَّا كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ سَبِيْلًا ۔ (۴۴)

کبھی تم نے اُس شخص کے حال پر غور کیا ہے جس نے اپنی خواہشِ نفس کو اپنا خدا بنا لیا ہو۔ کیا تم ایسے شخص کو راہِ راست پر لانے کا ذمہ لے سکتے ہو۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ ان میں سے اکثر لوگ سنتے اور سمجھتے ہیں؟ یہ تو جانوروں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی گئے گزرے۔

اس آیت سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ان لوگوں کی گمراہی کی اصل وجہ حق کو پہچاننے میں عقل کی عاجزی اور درماندگی نہ تھی بلکہ محض اتباع ہوائے نفس تھی اور اسی بنا پر یہ لوگ نہ تو عقل کی کوئی بات سوچتے تھے اور نہ نصیحت اور خیر خواہی کی کوئی بات سننے کے لیے آمادہ ہوتے تھے۔ انہیں قرآن مجید نے جانور یا جانوروں سے بھی بدتر اس لیے کہا ہے کہ جس طرح جانور اپنی خواہش کی پیروی میں جس کھیت میں چاہتے ہیں جا گھستے ہیں اور جس چیز پر اُن کا جی آتا ہے اُس پر ٹوٹ پڑتے ہیں اسی طرح یہ لوگ اپنے نفس کے اتباع میں ہر قسم کی من مانی کارروائیاں کرتے رہتے ہیں۔ حق و صداقت کا کوئی تقاضا ان کی راہ میں حائل نہیں ہوتا۔ جانور بیچارے تو عقل اور شعور کی کمی کی وجہ سے ایسی غیر ذمہ دارانہ حرکات کرتے ہیں لیکن انسان فہم و ادراک رکھنے کے باوجود جانوروں کی سی روش اختیار کرتا ہے اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اسی وجہ سے وہ جانوروں کی سطح سے بھی پست ہو جاتا ہے۔

اللہ کے دین سے انحراف کی طویل داستان کا اگر بنظرِ غائر مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت پوری طرح واضح ہو جائے گی کہ ضلالت اور گمراہی کے علمبردار یہی طبقے ہیں جن کا اُوپر ذکر کیا گیا ہے اور گمراہی جب بھی آتی ہے تو ان راستوں ہی سے آتی ہے جن کی نشاندہی کی گئی ہے۔ یہاں ذہن میں سوال اُبھرتا ہے کہ آخر کیا وجہ ہے کہ اچھے بھلے ہوشمند انسان حق و صداقت کی راہ چھوڑ کر باطل کی راہ اختیار کر لیتے ہیں۔ باطل میں آخر وہ کونسی ایسی جاذبیت ہے جو انسانوں کے قلب و دماغ کو مفتوح کر کے انہیں اُس کا تابع بنا دیتی ہے۔ اس کا جواب ایک ہی ہے کہ مادی زندگی کے مفادات جنہیں وہ جدید اصطلاح میں وقت کے تقاضے کہہ دیتا ہے، اُسے صراطِ مستقیم سے ہٹاتے ہیں۔ یہ مفادات انفرادی بھی ہو سکتے ہیں اور اجتماعی بھی لیکن جن چیزوں کو وہ عصری تقاضوں کے نام سے یاد کرتا ہے وہ بہر حال ہوتے مادی مفادات ہی ہیں۔ جب تک کسی قوم کے اندر مذہب کی بالادستی قائم رہتی ہے اور وہ اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے کسی مسئلے کے متعلق مذہبی اصولوں سے ہٹ کر کوئی طرزِ فکر اور طرزِ عمل اختیار کرنے پر آمادہ نہیں ہوتی اسوقت تک یہ مفادات مذہب کے تابع رہتے ہیں اور انسان کو اپنا پرستار نہیں بنا سکتے لیکن ان کے مقابلے میں جب دنیا کی محبت آخرت کے خوف پر غالب آجاتی ہے، جب اَن دیکھے خدا پر ایمان کی بجائے عالمِ محسوسات پر یقین بڑھ جاتا ہے جب دنیوی لذات روحانی اور اخلاقی قدروں کو پامال کرنے لگتی ہیں تو پھر وہ مذہب کو ان مادی مفادات کی بھینٹ چڑھا دیتا ہے۔ فکر و نظر کی یہ ہمہ گیر تبدیلی دفعۃً واقع نہیں ہو جاتی۔ یہ انقلاب بڑے غیر محسوس طریق سے آتا ہے اور آغاز میں اس کی رفتار بڑی سست ہوتی ہے لیکن اس سے مذہب اور دین پر دنیاوی مفادات پوری طرح مسلط ہو جاتے ہیں اور مذہب کی حیثیت اُس وفادار اور اطاعت شعار غلام سے زیادہ کچھ نہیں رہتی جس کا نہ اپنا کوئی ضمیر اور ایمان ہو اور نہ اپنی کوئی رائے بلکہ جس کی زندگی کا مقصد صرف اپنے آقا کے ہر حکم کی بغیر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کسی ادنیٰ تامّل کے تعمیل ہو۔

مذہب دنیاوی مفادات کا تابع بن کر کس طرح بگڑتا اور اپنی افادیت کھو دیتا ہے اس کے لیے ہم صرف ایک مذہب مسیحیت کا جائزہ لیتے ہیں۔ اس سے پوری حقیقتِ حال سامنے آجائے گی دینِ مسیحیت آغاز میں بالکل اللہ کا ایک سچا دین تھا جو بنی نوعِ انسان کی بھلائی اور اُخروی نجات کے لیے باری تعالیٰ نے سیدنا حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل فرمایا۔ یہ دین اپنے اصول و مبادی اور اپنے مزاج میں سراسر خیر تھا اور دنیا میں شر کو مٹانے اور انسان کو انسان کی غلامی سے آزاد کروانے کے لیے اس کا پرچار کیا گیا۔ جن لوگوں نے اسے اپنایا اُن کی زندگیاں اطاعت باری کا نہایت اعلیٰ نمونہ بن گئیں۔ اس سے دکھی انسانیت نے سکھ اور چین حاصل کیا۔ کمزور اور پسے ہوئے طبقوں نے اپنے اصل مقام کو پہچانا اور دنیاوی لذات میں کھوئے ہوئے انسان اخلاق اور روحانیت کی اعلیٰ اور ارفع قدروں سے لذّت آشنا ہوئے۔

مگر بُرا ہو مادی مفادات کا کہ بعض طبقوں نے مذہب کے نام پر انہیں حاصل کرنا شروع کیا۔ ظاہر بات ہے کہ یہ کام دینی تعلیمات کو جُوں کا توں رکھتے ہوئے تو نہ ہو سکتا تھا۔ چنانچہ ان تعلیمات میں من مانی تاویلات کا سلسلہ شروع ہوا جس نے بالآخر تحریفات کی گھناؤنی صورت اختیار کرلی اور اس طرح دین، خود دینی طبقوں کے ہاتھوں برباد ہو کر رہ گیا۔ رہبانیت، دین اور دنیا کی تفریق، مذہب کی امورِ دنیا سے بے تعلقی اور راہبوں کی غیر مشروط پیروی اور بت پرستی اور غیر اللہ کی پرستش اسی دَور کی پیداوار ہیں۔

مسیحیت کے لیے اُس دن سے زیادہ کوئی منحوس دن نہ تھا جب اس کا دائرہ سکڑنے لگا اور دنیاوی زندگی کو مذہبی اثرات سے آزاد کرنے کے لیے باطل نظریات گھڑے جانے لگے۔ دین اور دنیا کی دوئی کا تصوّر وہ پہلا مرحلہ تھا جس نے مذہب کو ایک بے جان قوت بنا کر رکھ دیا اور انسان

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کو یہ جرأت ہوئی کہ وہ اپنی اجتماعی زندگی کو اخلاقی اور روحانی اقدار سے بے نیاز ہو کر جس طرح چاہے تشکیل دے۔ جوں جوں اس تصور نے زور پکڑا یورپ کی پوری زندگی دو مختلف دھاروں میں بہنے لگی۔ ایک وہ دھارا جس میں روحانیت، اخلاق اور مذہب کے اجزا شامل تھے اور وہ انسان کے قلب اور روح کو سیراب کرتا تھا اور دوسرا وہ دھارا جس میں سوائے مادی مفادات کے اور کوئی چیز موجود نہ تھی اس دھارے سے انسانوں کی معاشرتی، معاشی، سیاسی زندگی کی آبیاری ہونے لگی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ معاشرے میں فکری اور عملی تضاد کے بڑے روح فرسا مناظر سامنے آنے لگے۔ ایک طرف راہب اور پادری کلیساؤں اور خانقاہوں کے اندر عشق الٰہی میں محو ہو کے خالص روحانی کیف و سرور سے لطف اندوز ہو رہے تھے مگر عبادت گاہوں کے باہر تمدن و سیاست میں، معیشت و معاشرت میں تعلیم اور بین الاقوامی معاملات میں سوائے مفادات کی حکمرانی کے اور کوئی چیز نظر نہ آتی تھی اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے دنیاوی مفادات پر ہر چیز کو قربان کر دیا تھا۔

قرآن مجید نے ایسے لوگوں کی زندگی کا یوں نقشہ کھینچا ہے:-

اِنَّ الَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ لِقَاءَنَا وَرَضُوْا بِالْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَاطْمَاَنُّوْا بِهَا وَالَّذِیْنَ هُمْ عَنْ اٰیٰتِنَا غٰفِلُوْنَ۔ اُولٰٓئِکَ مَاْوٰهُمُ النَّارُ بِمَا کَانُوْا یَکْسِبُوْنَ۔

حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ ہم سے ملنے کی توقع نہیں رکھتے اور دنیا کی زندگی پر ہی راضی اور مطمئن ہو گئے ہیں اور جو لوگ ہماری نشانیوں سے غافل ہیں ان کا آخری ٹھکانا جہنم ہوگا ان برائیوں کی پاداش میں جن کا اکتساب وہ (اپنے اس غلط عقیدے اور غلط طرز عمل کی وجہ سے) کرتے رہے ہیں۔

پھر ان میں سے ہر شخص کی اپنی انفرادی زندگی بھی عجیب و غریب تضاد کا شکار ہوئی وہ لوگ جو مذہبی دائرے کے اندر بڑی نیکی، خدا ترسی اور پرہیزگاری کے دعویدار تھے وہ بھی اجتماعی معاملات میں بڑے ظالم خود غرض، سفاک اور بے اصولے ثابت ہوئے اور انہوں نے معاشرتی، معاشی اور سیاسی زندگی کو عام انسانوں کے لیے عذاب بنا دیا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دین اور دنیا کے درمیان یہ خلیج آہستہ آہستہ وسیع ہوتی چلی گئی۔ دنیاوی مفادات نے دینی مفادات کے دائرے کو اتنا تنگ کر دیا کہ دین صرف عبادت گاہوں میں پناہ لینے پر مجبور ہو گیا لیکن اپنے مقام پر اس کا بہرحال ایک وزن تھا اور عوام اُس کے فیصلوں کو عقیدت و احترام کے ملے جلے جذبات کے ساتھ دیکھا کرتے تھے۔ وہ اگرچہ دین کے ان فیصلوں کے مطابق اپنی اجتماعی زندگی کی تشکیل کرنے پر قدرت تو نہ رکھتے تھے مگر دینی تعلیمات کو یکسر نظر انداز کرنا بھی اُن کے بس میں نہ تھا۔ اس سے اُن کے ذہنوں میں کشمکش پیدا ہو گئی۔ یہی وہ عہد تھا جب یورپ میں صنعتی انقلاب رونما ہوا اور انسان نے بھاپ کے دیو کو مسخر کر کے اشیاء کی کثیر پیداآوری اور زود پیداآوری کے لیے اس سے کام لینا شروع کیا اور اس سے نئے نئے معاشی، سیاسی اور معاشرتی تقاضے جنم لینے لگے۔ اہل یورپ کے لیے یہ ایک زبردست آزمائش کا وقت تھا۔ وہ ایک ایسے اہم مقام پر لا کر کھڑے کر دیئے گئے تھے جہاں انہیں مذہب کے بارے میں آخری اور قطعی فیصلہ کرنا تھا۔ وہ اگر چاہتے تو صنعتی انقلاب کو ایک ایسے نہج پر ڈال سکتے تھے جس سے مذہبی اقدار برباد نہ ہوتیں بلکہ یہ صنعتی ترقی ان کے تابع رہ کر انسانیت کے لیے زیادہ مفید اور کارآمد ہوتی اور اس سے وہ افسوسناک نتائج پیدا نہ ہوتے جو آج ہم پوری دنیا میں دیکھ رہے ہیں۔ لیکن اسے انسانیت کی سیاہ بختی کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ اہل یورپ نے اس فیصلہ کن مرحلے میں بڑا غلط فیصلہ کیا اور محض مادی مفادات کو وقت کے تقاضے سمجھ کر مذہب کو بالکل پس پشت ڈال دیا۔

جن مسائل کو یہ لوگ عصری تقاضے کہتے ہیں وہ کوئی ایسے قوانین تکوینی نہیں جن سے انسان کو کوئی مفر نہ ہو بلکہ یہ معاشی، سیاسی اور معاشرتی زندگی کے وہ مختلف انداز ہیں جنہیں انسان اپنی منشا اور مرضی کے مطابق اختیار کرتا ہے۔ مثلاً اگر یورپ میں چند انسانوں کو اس بات کی کھلی چھٹی مل گئی تھی کہ وہ جس طرح چاہیں غریبوں کا خون نچوڑ کر دولت جمع کریں اور اس طرح امیر اور غریب طبقوں کے درمیان کشمکش پیدا ہو تو معاشرے کے اندر لوگوں نے یہ ظالمانہ روش کسی غیر اختیاری محرک کی وجہ سے مجبوراً

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اختیار نہ کی تھی بلکہ چند مفاد پرست طبقوں نے محض اپنے ناجائز مفادات کے حصول کے لیے عوام کو اس غلط راہ پر ڈال دیا تھا۔ اور وہ بیچارے جب ان مصائب سے تنگ آ کر اس ظلم و ستم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے تو انہیں یہ کہہ کر خاموش کر دیا جاتا کہ تمہیں یہ ساری پریشانیاں اور بربادیاں خوشدلی کے ساتھ برداشت کرنی چاہیں کیونکہ یہ وقت کے تقاضے ہیں گویا کہ سارا ظلم و استبداد نوشتۂ تقدیر ہے جسے کسی صورت بھی بدلا نہیں جا سکتا۔

عصری تقاضوں کے فتنے یوں تو بیشمار ہیں لیکن ہم صرف اُن کی چند مثالیں پیش کرتے ہیں۔ صنعتی انقلاب سے پیشتر مسیحی معاشرے میں بے جان سکوں کے مقابلے میں انسان کی قیمت کہیں زیادہ تھی لیکن اس انقلاب کے بعد جب دولت پرستی کا جنون پیدا ہُوا تو انسان کی قدر کم ہونے لگی اور اس کی جگہ سکوں کا اقتدار بڑھنے لگا اور انسان نے وہ سارے حربے استعمال کرنے شروع کیے جن سے وہ زیادہ سے زیادہ دولت جمع کر سکے۔ اس مقصد کے لیے سب سے موثر ہتھیار سُود تھا لیکن بائیبل اسے کسی طرح بھی جائز قرار نہ دیتی تھی۔ چنانچہ اس الجھن کو دُور کرنے کے لیے سب سے پہلے یہ اصول طے کیا گیا کہ مذہب کو تجارتی معاملات میں دخیل نہ ہونا چاہیے اور پھر عوام کے ذہنوں میں یہ بات آہستہ آہستہ بٹھائی جانے لگی کہ بائیبل جس سُود کی حُرمت کا فتویٰ صادر کرتی ہے وہ تجارتی قرضوں کا سود نہیں بلکہ وہ زائد رقم ہے جو کسی ضرورتمند کی مجبُوری اور بے بسی کے پیشِ نظر اُس سے وصول کی جاتے۔ اِس طرح آہستہ آہستہ لوگوں کے ذہنوں سے سُود کی حُرمت کا احساس مٹتا چلا گیا۔

انسان کی قدر و منزلت کم ہونے اور دولت کا احترام بڑھنے کا دوسرا اثر یہ ہُوا کہ دنیا چھوٹے چھوٹے گروہوں میں منقسم ہو گئی اور ہر گروہ دوسرے گروہ سے برسرِ پیکار رہنے لگا۔

اہلِ یورپ صنعتی انقلاب سے پیشتر جس مذہب سے آشنا تھے اس نے انسان اور انسان کے درمیان بھائی چارے کے تعلقات قائم کر رکھے تھے۔ خدا بندوں سے جب بھی معاملہ کرتا ہے تو وہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نسلی اور وطنی بنیادوں پر نہیں کرتا بلکہ خالص انسانی بنیادوں پر کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تمام الہامی مذاہب نے خاک وخون کے اختلافات کو ہمیشہ نفرت کی نگاہ سے دیکھا ہے اور جن لوگوں نے ان اختلافات کو اُبھارا ہے اُن کی ہمیشہ مذمت کی ہے۔ مذہب ہر دور میں انسان کو انسان سے قریب لانے کا سب سے مؤثر ذریعہ رہا ہے۔ یورپ میں انسانوں کے درمیان بعد و بیگانگی کا احساس صنعتی انقلاب سے پہلے اگرچہ کسی حد تک شروع ہو چکا تھا لیکن وہ چونکہ سارے ایک چرچ کے تابع اور ایک روحانی پیشوا کے مطیع اور فرمانبردار تھے اس لیے اُن کے اندر کسی حد تک اخوّت کا تعلق بھی پایا جاتا تھا۔ مگر اخوّت کا یہ رشتہ دولت پرستی کے مجنونانہ جذبۂ مسابقت میں مانع تھا۔ دنیا کے سارے ممالک کے دولتمند طبقوں کو صرف ایک فکر ہی کھائے جا رہی تھی کہ وہ کسی طرح اس دوڑ میں ایک دوسرے پر بازی لے جائیں اور دنیا کی ساری دولت خود اکٹھی کر لیں۔ اس مقصد میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے سب سے پہلے تو ان عیّار طبقوں نے اپنے اپنے ملک کے عوام کو بیوقوف بنایا اور ان کے ذہن میں یہ بات بٹھائی کہ ان کی محبت و عقیدت کا مرکز صرف اُن کا اپنا وطن ہونا چاہیے۔ جو لوگ دوسرے ممالک سے تعلق رکھتے ہیں وہ اُن کے دشمن ہیں اور انہیں سوائے اُن کے خلاف نفرت اور حقارت کے اپنے اندر کوئی دوسرا احساس پیدا نہ کرنا چاہیے بلکہ انہیں دنیا سے مٹانے اور نیست و نابود کرنے کی مختلف تدابیر سوچنی چاہییں۔ اس طریق سے دولت پرستی نے قوم پرستی کو جنم دیا اور مادّی مفادات نے قومی تقاضوں کی صورت اختیار کر لی۔ چنانچہ اب اس نقطۂ نظر سے مذہب کے اندر بھی تبدیلیاں کی جانے لگیں۔ اس ضمن میں عوام کے اندر یہ احساس اُبھارا گیا کہ آخر یہ کیا حماقت ہے کہ ایک شخص پُوری دنیا کی مسیحیت کا روحانی پیشوا ہو۔ جب ہر ملک کے مفادات اور تقاضے الگ ہیں، جب ہر ملک کی اپنی الگ ضروریات ہیں تو لازمی طور پر اُن کا مذہب بھی الگ اور جُداگانہ ہونا چاہیے اور اُن کی مذہبی تنظیم بھی اُن کی اپنی حکومت کے ہاتھ میں ہونا چاہیے جو مذہب کو اُن کی اپنی قومی اور وطنی ضروریات کے مطابق ڈھال سکے۔ اس طرزِ فکر کا سب سے پہلا اثر یہ ہُوا کہ پُوری دنیائے مسیحیت کا شیرازہ منتشر ہو گیا اور وہ مرکزیت ختم ہو گئی جس نے مذہب کی عملداری کو کسی حد تک قائم کر رکھا تھا۔ اب ہر حکومت نے اپنی براہِ راست نگرانی میں اپنی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ضروریات کے مطابق مذہبی نظام قائم کیے۔ حکومت چونکہ دولت مند طبقوں کے ہاتھ میں تھی اس لیے مذہب کی تشکیل تو عملاً دولت پرستوں کے رجحانات کے عین مطابق کی گئی اور اس میں اُن کے مادی مفادات کا پورا پورا خیال رکھا گیا۔ مذہب کی آزاد اور حاکمانہ حیثیت ختم ہو گئی اور اب وہ بادشاہوں، برسر اقتدار طبقوں، معاشرے کے با اثر افراد اور بڑے بڑے تاجروں اور صنعت کاروں کا غلام بن کر رہ گیا۔ اس نئے مذہب نے انسانیت کے مقدس رشتوں کو منقطع کر کے اُن کی جگہ نفرت وحقارت کے بیج بوئے اور اپنی عافیت اسی میں سمجھی کہ ملک کے مفاد پرست طبقوں کی پشت پناہی کے لیے فتوے دیتا رہے۔ مذہب کے علمبردار جن کی طرف عوام ہدایت اور رہنمائی کے لیے رجوع کیا کرتے تھے وہ حکومت اور اصحابِ اقتدار کے ایجنٹ اور آلۂ کار بن گئے۔ عوامی مسائل اور غریب طبقوں کے دکھ درد یا حکومت کی ریشہ دوانیوں اور دست درازیوں سے اب انہیں کوئی سروکار نہ تھا۔ اُن کی زندگی کا اب ایک ہی مقصد تھا کہ وہ ملک کے دولت مند طبقوں کے مفادات کی ہر طریق سے حفاظت و پاسبانی کریں۔ مذہبی تعلیمات میں تحریفات کرنے والوں کی بڑی پذیرائی ہونے لگی اور جو شخص اس معاملے میں جتنا زیادہ جری اور بیباک تھا اور اصحابِ اقتدار کے ذوق کے مطابق دین کو ڈھالنے میں جتنی زیادہ ہنر مندی اور چابکدستی دکھا سکتا تھا اسی نسبت سے وہ چرچ کے اندر اونچے مناصب پر فائز کیا جانے لگا۔ اس نئے مذہبی طبقے نے مذہب کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا۔ قوم پرستی کے لیے باطل احساسات فراہم کیے، مذہب کو حکومت کا تابع کیا، خدا ترس، آزاد اور حق و انصاف کے علمبردار اہلِ کلیسا کی جگہ مذہبی تنظیمات کی باگ ڈور بھی خالص مفاد پرستوں کے ہاتھ میں دے دی جنہوں نے مذہبی مرکزیت کو برباد کیا اور مذہب کے حیات آفریں اصولوں کو بدل کر اُن کی جگہ ایسے اصول داخل کیے جن سے سوائے مفاد پرستی کے اور کسی جذبہ کو تقویت نہ پہنچتی تھی۔ اوقاف کی بے پناہ دولت مذہب کی توسیع و اشاعت پر صرف ہونے کے بجائے حکومتوں کے پروپیگنڈے پر بے دریغ خرچ ہونے لگی۔ یہ حضرات آغاز میں تو بے حد خوش تھے کہ چلیے پاپائے روم کی غلامی سے تو نجات ملی لیکن جب انہیں مفاد پرست اصحابِ اقتدار کی غلامی کا طوق پہننا پڑا تو اس وقت انہیں اپنی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بے بسی اور تکلیف کا احساس ہوا۔ جو لوگ ان میں ذرا باضمیر اور حسّاس تھے اُن پر عرصۂ حیات تنگ کیا گیا اور جنہوں نے ان اصحاب اقتدار کے طرزِ عمل کی تائید کرنے میں ذرا بخل سے کام لیا انہیں مختلف اذیتیں دے دے کر مارا گیا۔ لوگوں کے ذہنوں میں پاپائے روم کی دراز دستیوں کی داستانیں محفوظ ہیں لیکن اگر وہ قومی کلیسا کے علمبرداروں کے مظالم کا مطالعہ کریں تو ان کی ہولناکیاں کسی طرح بھی رومی کلیسا سے کم نہ تھیں۔ پھر پاپائے روم اگر مذہب کے اندر کوئی تحریف بھی کرتا تو وہ پوری دنیائے عیسائیت کے مفاد کو سامنے رکھ کر یہ جسارت کرتا لیکن قومی کلیساؤں نے تو اس معاملے میں دیانت اور امانت کے سارے تقاضوں کو نظر انداز کر کے صرف قومی تقاضوں کے مطابق ہر طرح کی تاویلات بلکہ تحریفات کرنا شروع کیں۔ چنانچہ مذہب کی حیثیت ایک رہنما قوت کی حیثیت سے بالکل ختم ہو کر رہ گئی۔ مذہب اب ایک مرغِ بادنما تھا جسے مفادات کے تھپیڑے، جنہیں عوام کو فریب دینے کے لیے قومی تقاضے یا زیادہ خوش کُن الفاظ میں عصری تقاضے کہا جاتا تھا جس طرف چاہتے گھما دیتے۔ ظاہر بات ہے کہ ایسی بے جان اور غیر موثر چیز دنیا میں کب تک زندہ رہ سکتی تھی، اس لیے عوام نے جلد ہی اس کا قلادہ اپنی گردنوں سے اتار پھینکا۔ مفاد پرستی کے دور میں اس کی اگر کچھ افادیت باقی رہ گئی تو وہ اس قدر تھی کہ استعمار پسند قومیں جب مادی مفادات کے حصول کے لیے کمزور اقوام پر یلغار کریں تو مذہب کے علمبردار استعمار کے ایجنٹ کی حیثیت سے ان مظلوم قوموں کے اندر نفاق پیدا کرنے کے لیے جدوجہد کریں اور اس طرح سامراجی عزائم کی تکمیل کا موثر ذریعہ ثابت ہوں۔

ملتِ اسلامیہ کی یہ انتہائی بدنصیبی ہے کہ عصری اور قومی تقاضوں سے اس کے بہی خواہ بھی ایسے بُرے مرعوب ہو رہے ہیں۔ اس ضمن میں انہیں سب سے پہلے اس بات پر غور کرنا چاہیے کہ ان میں سے کتنے تقاضے ایسے ہیں جو ناگزیر ہیں۔ حالات کا مطالعہ تو یہ ثابت کرتا ہے کہ دورِ حاضر کا ایک تقاضا بھی ایسا نہیں جو قانونِ تکوینی کی طرح اٹل ہو اور جس سے کوئی مفر نہ ہو۔ یہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نام نہاد تقاضے خود اہلِ مغرب کے اپنے پیدا کردہ ہیں۔ انہوں نے اپنے مخصوص مفادات کی خاطر انہیں جنم دیا اور پھر ان کے اندر جاذبیت پیدا کرنے کے لیے یہ کہنا شروع کر دیا کہ یہ وقت کا اقتضا ہیں۔ مثلاً جب مسلک انفرادیت پسندی میں فائدہ نظر آیا تو اسے وقت کا تقاضا کہنا شروع کیا اور جب اجتماعیت میں مادی فوائد حاصل ہونے کے روشن امکانات نظر آئے تو اسے وقت کا تقاضا کہہ دیا۔ اور قومی ملکیت کا پرچار شروع کر دیا۔ جب عوام پر قوم پرستی کا جنون سوار کرکے اپنا مطلب نکلتا ہو تو وطن کو معبود بنا لیا اور اگر کمزور کو لوٹنے کے لیے چند قوموں کا اشتراک ضروری معلوم ہوا تو پھر آئیڈیالوجی کی حکمرانی کا نعرہ لگانا شروع کیا اور دنیا کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ ہمارے پیشِ نظر کوئی قومی مفادات نہیں بلکہ انسانیت کی خیر اور بھلائی ہے آخر خود غور کیجیے کہ وہ کونسا ایسا عصری تقاضا ہے جسے قوموں نے نظر انداز نہیں کیا۔ اگر ان تقاضوں کے علمبردار انہیں کوئی اہمیت نہیں دیتے اور جب چاہتے ہیں انہیں نظر انداز کر دیتے ہیں تو آخر ہمارے لیے یہ کیوں اتنے اہم ہیں کہ ہم ان کی خاطر اللہ کے دین کو بدلنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ وہ خالق جس نے انسان اور ساری کائنات کو پیدا کیا ہے جو علیم و خبیر ہونے کی وجہ سے انسان کے ہر چھوٹے بڑے تقاضے کو اچھی طرح جانتا ہے، اُس کی نظر میں اگر ہمارے عہد کے تقاضے اتنے شدید ہوتے کہ ہم اُس کی نازل کردہ تعلیمات کو بدلنے پر مجبور ہو جاتے تو وہ ہمیں یہ بشارت کبھی نہ دیتا:

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا۔ (المائدہ: ۳)

آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لیے مکمل کر دیا ہے اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی ہے اور تمہارے لیے اسلام کو تمہارے دین کی حیثیت سے قبول کر لیا ہے۔

© rasailojaraid.com